عباس رضا نیّر جلالپوری

کہانی، بیانیہ اور انیسؔ

(مرثیہ درحال شیرین کا خصوصی تجزیہ)

اچھی کہانی، بری کہانی، بڑی کہانی، چھوٹی کہانی، پرانی، نئی کہانی، مسرت آمیز کہانی، درد انگیز کہانی، کہانی بہر حال کہانی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کہانی کہنے کا فن معمولی کہانیوں کو اچھی کہانیوں میں بدل دیتا ہے۔ چھوٹی کہانیوں کو بڑی کہانی بنا دیتا ہے اور کبھی کبھی کہانی کہنے کے فن کی کوتاہی کے نتیجے میں اچھی کہانیاں بھی انسانی فکر کو متاثر کرنے میں ناکام رہ جاتی ہیں۔ یہ کہانی کہنے کا فن ہی ہے جو فرضی واقعات کو تاریخی واقعیت کے زمرے میں داخل کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تاریخی واقعیت کہانی کہنے کے فن کے فقدان کے سبب داستان گم گشتہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہانی کو اگر تاریخی صداقت کا سہارا مل جائے تو جہاں کہانی کی معنویت او اثر انگیزی ہزاروں گنا بڑھ جاتی ہے وہیں کہانی کہنے والے کی اپنی ذمہ داریوں میں بھی ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ تاریخی کہانی کو پر پھیلانے کے لئے آسمان تخیل کی نہ وہ وسعتیں حاصل ہوتی ہیں اور نہ وہ اڑن پرواز جو ایک فرضی کہانی کو فطری طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود تاریخی کہانی کو بھی کہانی کہنے کے ایک ایسے کمال فن کی ضرورت ہے جو اس کی تاریخی واقعیت کو کسی تخیلاتی مفروضے کے سہاروں سے مستحکم نہ کرے کیونکہ اس میں خود تاریخی صداقتوں کے مجروح ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ تاریخی واقعہ کو بیان کرتے وقت کہانی کار کی اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی تخیل کے بازوں کو حقیقت کی دنیا سے پرے پھیلانے کی کوشش نہ کرے اور اس کے باوجود کہانی کہنے کے فن کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کر دے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ کہانی کار کی تخیل نے کہانی کی تاریخی واقعیت کو مجروح نہ کیا ہو۔ کیوں کہ تخیل واقعہ سے

ماورائی ہے۔ لیکن جن تاریخی واقعات میں کہانی بننے کی صلاحیت ہے ان واقعات میں جہاں جہاں تاریخ خاموش ہے وہاں وہاں تخیل مناظر اور مکالمے پیدا کر دیتی ہے۔ کہانی کہنے والے کا بنیادی فن یہی ہے کہ وہ تاریخ کی بین السطور خاموشی کو منظر یا مکالمے میں ڈھالتے وقت جو کچھ تخلیق کرے وہ اس واقعے کے مزاج، کیفیت اور محل کے خلاف نہ ہو۔ گویا قاری یا سامع کو یہ لگے کہ بیشک تاریخ میں اس منظر یا مکالمے کا تذکرہ بھلے ہی نہ ہو لیکن اگر یہ منظر اس واقعے میں پیدا ہوا ہوتا تو یقیناً یہی مکالمہ ہوتا۔ تب تاریخ کی بین السطور خاموشی کو لفظوں کا لبادہ دینے والا فنکار مورخ کی مشاہدہ کرنے والی آنکھ بن جاتا ہے۔ یعنی قاری یا سامع یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ منظر اور یہ مکالمہ سب کچھ واقعہ میں موجود تھا مورخ نے احتیاط اختصار کی وجہ سے اس کو قلم بند نہیں کیا۔

اردو کے بہت سے مرثیہ نگاروں نے کربلا کی درد انگیز تاریخ کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ موثر کہانی بنا کر عوام تک پہنچایا ہے۔ اگر چہ مرثیہ نگاروں کی کہانی نے کہیں کہیں تاریخ سے تجاوز کیا ہے لیکن کہانی کو محض تخیل یا مفروضات کے حوالے بھی نہیں کیا ہے۔ اردو مرثیے میں اگر کہیں تاریخ سے تجاوز کی کوئی مثال نظر آتی ہے تو اسے بھی کسی نہ کسی روایت کا سہارا ضرور حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس روایت کے تاریخی استناد پر بحث کی گنجائش موجود ہو۔ لیکن ایسی ساری روایتوں کا رشتہ ایک ہی ایسی مستحکم واقعیت سے جڑا ہوا ہے جو انھیں تاریخی استحکام بخش دیتی ہے۔ یوں بھی مرثیہ نگاروں کی کہانی کا موضوع چند ایک جہتوں میں ہی پرواز کی اجازت دیتا ہے۔ کربلا کی کہانی خود اپنے اندر اتنے تنوع اور اتار چڑھاؤ رکھتی ہے کہ اس کے لئے کسی مفروضے کا سہارا لینے کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ ایک کہانی کے جو لازمی عناصر ہوتے ہیں وہ سب کربلا کے تاریخی سانحے میں موجود ہیں جہاں ایک طرف عشق، عرفان اور آگہی ہے تو دوسری طرف ظلم، وحشت اور بربریت۔ ادھر محبت ایثار اور جانثاری ہے تو ادھر مکر، فریب اور عیاری۔ گویا ایک کامیاب کہانی کے سہارے تلازمات کربلا کے تاریخی واقعہ

سے بہ آسانی فراہم کئے جاسکتے ہیں۔ کہانی کی دنیا میں عظیم ترین شاہکار غم انجام واقع ہوئے ہیں چنانچہ کربلا کی کہانی ایک ایسا رزمیہ ہے جس کا اختتام غم بلکہ انتہائے غم پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی کربلا کہانی کا ایک شاہکار ہے۔ مرثیے نے اپنی شعری نزاکتوں اور فنی طاقتوں سے اس حزنیہ کہانی کی درد انگیزیوں کو انسانی فطرت کے عین مطابق اور انسانی فکر کے حد درجہ قریب کردیا ہے۔ اس طرح مرثیے نے کربلا کی کہانی کو ایک عام آدمی تک پہنچانے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔

کہانی کہنے کا فن یوں تو ہر اچھے مرثیہ نگار کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن میر انیسؔ نے کہانی کہنے کے فن کو اعتبار وعظمت کی جن اونچائیوں تک پہنچا دیا ہے وہ فقید المثال ہے۔ انیسؔ اپنی فکر وفنی صلاحیتوں کی بنا پر مرثیہ نگاروں میں منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔

قدرت کے عطا کردہ بیانیہ کے اس فن نے جہاں انیس کی وقعت وعظمت میں اضافہ کیا وہیں انیسؔ کی باریک بینی، فطری جذبات اور نفسیات کی عکاسی نے بیانیہ کے فن کی عظمتوں میں بھی اضافہ کیا۔ انیسؔ کا تخیل واقعے کے پس منظر میں چھپی ہوئی ان جزئیات کو بھی تلاش کرلیتا ہے جو بیانیہ میں شامل ہوکر کہانی کا لازمی عنصر نظر آنے لگتی ہیں اور واقعے کے نفسیاتی ماحول کی تشریح کرنے لگتی ہیں۔ کہانی اور بیانیہ کے حوالے سے جائزہ لینے کے لئے یہاں ہم نے انیس کے مشہور مرثیے کا انتخاب کیا ہے۔

ع۔ اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیرؑ

یہ مرثیہ زوجۂ امام حسینؑ حضرت شہر بانو اور خود امام حسینؑ کی خلوت کے ایک لطیف ترین لمحے سے آغاز ہوتا ہے۔ حضرت شہر بانو شہنشاہ ایران یزدجرد کی بیٹی اور امام زین العابدین کی والدہ ہیں۔ ایک عصمت مآب خلوت کا تمام تر تقدس انیسؔ کی نگاہ میں ہے۔ زوجین کے درمیان ہونے والی گفتگو کو انیسؔ نے اپنی عقیدت واحترام کے باوجود عام انسانی سماج کے حد درجہ نزدیک اور فطری کردیا ہے۔ امام حسینؑ حضرت شہر بانو کی کنیز شیریں کی آنکھوں کی

تعریف کرتے ہیں۔ چونکہ حضرت شہر بانو معصوم نہیں ہیں اس لئے انھیں یہ گمان گذرتا ہے کہ شاید امام حسینؑ کو یہ کنیز پسند خاطر ہو۔ ایک وفا شعار اور اطاعت گزار بیوی فطرت کے عین مطابق اپنی کنیز کو سجا سنوار کے امام حسینؑ کی کنیزی کے لئے پیش کرتی ہے۔ اپنی خواہشات نفسانی کو رضائے الٰہی کی خاطر بیچ کرنے والا معصوم امام کسی کنیز کی آنکھوں کی تعریف اس مقصد سے کربھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن امام حسینؑ جناب شہر بانو کے گمان کو اپنی وسیع القلبی اور عفو کی عادت سے کام لے کر کنیزی میں قبول کر کے انعام واکرام دے کر آزاد کر دیتے ہیں ۔ وہ کنیز جسے اس گھرانے کی خدمت کرتے کرتے گھر کے ایک ایک فرد سے عشق ہو چکا ہو اور اسے یہ جدائی شاق تو ہے لیکن حکم امام سے مجبور ہو کر ڈیوڑھی سے رخصت ہوتے وقت ہر فرد سے وعدہ لیتی ہے کہ وہ اسے اپنے غم اور خوشی سے دور نہ کرے۔ ہر موقع پر اسے یاد کرے اور کسی دن اس کے یہاں مہمان ہونا قبول فرمائے۔ امام حسینؑ وعدہ فرما لیتے ہیں لیکن یہ وعدہ بڑے عجیب انداز میں ایفا ہوتا ہے یعنی امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ! شام کا لشکر حسینؑ کا سر بریدہ نیزے پر رکھ کر جب دمشق کے لئے روانہ ہوتا ہے تو راستے میں وہ قریہ بھی ہوتا ہے جہاں شیریں آزادی کے بعد اپنی خانگی زندگی گذارنے لگتی ہے ۔ حسینؑ کا بریدہ سر اور حسینؑ کے تمام رسن بستہ حرم ایک شب شیریں کے یہاں مہمان ہوتے ہیں۔ مگر کیسے ؟ یہی اس کہانی کا حسن اور کلائمکس ہے۔ اس کہانی میں انیسؔ نے اپنی فنکارانہ چابک دستی سے پورے بیانیے کو اتنا فطری اور بے ساختہ بنا دیا ہے کہ قاری یا سامع کے ذہن کو کسی تاریخی استدلال کی حاجت نہیں رہ جاتی ۔ کہانی کا آغاز شیریں کی آنکھوں کے حسن کی تعریف سے ہوتا ہے اور کہانی کے اختتام میں شیریں قدرت سے شکوہ کرتی نظر آتی ہے کہ کیا اسی اندوہ ناک منظر کو دیکھنے کے لئے میری آنکھیں سلامت ہیں۔ کیوں ! ہے نا انیسؔ کو کہانی اور بیانیہ کے فن پر پوری قدرت !!

۸۸ ربند پر مشتمل انیس کا یہ مرثیہ امام حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ انیسؔ نے امام حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے کی دلیل میں حسین اور خدا

کے درمیان ہونے والے اس وعدہ طفلی کا حوالہ پیش کیا ہے جو امام حسینؑ نے عصر عاشور سجدے میں سر قلم کرا کے وفا کیا ہے

اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیرؑ — دریائے وفا کے در شہوار تھے شبیرؑ
خوشنودی خالق کے طلبگار تھے شبیرؑ — اقلیم صداقت کے جہاں دار تھے شبیرؑ

چاہا جو خدا نے وہی چاہا شہ دیں نے
کیا وعدہ طفلی کو نباہا شہ دیں نے

مرثیے کے ابتدائی چار بند اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ انیس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کسی شاعرانہ مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ تاریخی واقعیت کو دلیل بنا کر امام حسینؑ کے مزاج ایفائے عہد کو ظاہر کیا ہے مثلاً تیسرے بند کی بیت دیکھئے

وعدہ فقط اک سر کا تھا درگاہ خدا میں
حضرت نے بہتر دیئے سر راہ خدا میں

یا پھر چوتھے بند کی بیت ہے

اس طرح کے صادق کبھی دیکھے ہیں کسی نے
مر کر کیا وعدے کو وفا سبط نبی نے

پانچویں بند سے انیس نے کہانی کا آغاز کیا ہے۔ منظر امام حسینؑ اور ان کی زوجہ حضرت شہر بانو کی خلوت کا ہے۔ جہاں بقول انیس

بانو سے جو مانوس شہنشاہ زمن تھے
کچھ پیار کی باتیں تھیں محبت کے سخن تھے

کہانی کی دلکشی اس کی ابتدا سے ہی قائم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس گفتگو ئے محبت میں امام حسینؑ کی نگاہ حضرت شہر بانو کی کنیز خاص شیریں کی خوبصورت آنکھوں پر پہنچ جاتی

ہے۔ دیکھیے انیسؔ اس لطیف منظر کو کسی قدر فطری انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

شیریں پہ جو حضرت کی نظر جا پڑی اک بار　　بانو سے یہ بولے بہ تبسم شہ ابرار
خوش چشم کس مرتبہ شیریں خوش اطوار　　اس طرح کی آنکھیں کبھی دیکھی نہیں زنہار

فرمائی جو یہ بات شہنشاہ امم نے
نیوڑھا لیا سر دختر سلطان عجم نے

مرثیے کے اگلے پانچ بند ایک محبت گزار اور وفا شعار بیوی کی نفسیات کا بیانیہ ہیں۔ جہاں ایک خاتون شوہر کی خوشنودی کی خاطر اپنی کنیز کو اپنے سے زیادہ محترم اور صاحب جاہ کہتی ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کے ذی جاہ شوہر کی نگاہ پسند نے اِسے منتخب کرلیا ہے حالانکہ یہ عام عورتوں کی فطرت سے بہت بعید ہے لیکن جو خاتون حسینؑ جیسی عظیم شخصیت کی زوجیت میں ہو، اپنے شوہر کیلئے اس کا یہ جذبۂ اطاعت قطعی غیر مانوس معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ حضرت شہر بانو کے کوائف وحالات سے آگاہ لوگوں کیلئے یہی بات عین مطابق فطرت معلوم ہوتی ہے۔

یہیں سے انیسؔ اپنے قاری کو نہ صرف یہ کہ حضرت شہر بانو کی شخصیت اور مزاج سے متعارف کراتے ہیں بلکہ پورے خانوادۂ عصمت کے ماحول سے نہایت مختصر الفاظ اور انتہائے قدرت فن کے ساتھ روشناس کرادیتے ہیں۔ دیکھئے کہانی کس طرح آگے بڑھتی ہے۔ شہر بانو شیریں کو اشارے سے بلاتی ہیں۔ ایک حجرے میں لے جاتی ہیں اُسے خوبصورت پوشاک پہناتی ہیں۔ گیسوؤں میں شانہ کرتی ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہیں۔ یہ سب ہوتے ہوئے دیکھ کر بچپن سے شہر بانو کی تربیت میں رہنے والی کنیز ملکہ سے بصد استعجاب ماجرہ پوچھتی ہے۔ ملکہ بہ ہزار افتخار آج خود کو کنیز کی لونڈی بتاتی ہے۔ شیریں کو موتی ہیروں سے آراستہ کرلینے کے بعد شہر بانو امام حسینؑ کو حجرے میں بلاتی ہیں۔ امام حسینؑ کو احساس ہوتا ہے کہ شاید شہر بانو میری باتوں سے آزردہ ہوں۔ چنانچہ انیسؔ اس مقام پر امام حسینؑ کی زبان سے یہ مکالمہ ادا کراتے ہیں ؎

جو سمجھی ہو تم اس کا مجھے دھیان نہیں ہے۔
جب تم سی ہو بی بی تو کچھ ارمان نہیں ہے

کہانی آگے بڑھتی ہے۔ امام حسینؑ اپنی اطاعت شعار بیوی کے نذرانے کو قبول کرتے ہی، آزاد کر دیتے ہیں اور اس طرح اپنی زوجہ کو زیان وقار واحترام کی بدگمانی سے بھی آزاد کر دیتے ہیں۔

تم نے تو دیا ہم کو صادق ہو وفا میں
ہم نے اسے آزاد کیا راہ خدا میں

حکم امام پاکر شہر بانو اپنی کنیز کو کثیر زرومال اور انعام واکرام کے ساتھ آزاد کرتی ہیں۔ امام حسینؑ شہربانو سے آج اس خاص انداز سے مائل بہ کرم ہونے کا سبب پوچھتے ہیں۔ منظر مزید التفات کا مظہر ہوجاتا ہے۔

بانو نے سنی جب شہ والا کی یہ گفتار — خوش ہو کے پھری گرد محبت سے کئی بار
اور اس کو دیا زیور و زر، درہم ودینار — حضرت نے کہا اس کا سبب کیا مری غم خوار

اوروں کو نہ اتنا زرو زیور دیا تم نے
شیریں سے یہ الفت کہ غنی کر دیا تم نے

اگلا بند امام حسینؑ کے سوال کی وضاحت کرتا ہے اور اسی بند کو انیسؔ خانوادہ عصمت وطہارت کی عظمتوں کے اظہار کا زینہ بنا دیتے ہیں۔

بانو نے کہا ان سے ہو کیوں کر یہ برابر — آزاد کیا تھا انھیں میں نے مرے سرور
ہر چند کہ سلطان عجم کی ہوں میں دختر — پر فاطمہ زہراؑ کی کنیزوں سے ہوں کمتر

خود صدقے ہوں شیریں پہ اگر میں تو بجا ہے
فرزند نبیؐ نے اسے آزاد کیا ہے

یہاں کہانی میں ایک اہم موڑ آتا ہے۔ کہانی ہجر کے مناظر میں داخل ہونے لگتی

ہے۔ یہیں پر انیسؔ کہانی میں آگے چل کر کام آنے والے بعض اہم کرداروں کو اپنے قاری سے بیک وقت متعارف کرادیتے ہیں ۔ مثلاً سید سجاد اور جناب زینب کے کردار۔ ان کرداروں کے تعارف میں شیریں کی ان سے والہانہ عقیدتیں بھی واضح ہوجاتی ہیں ۔ انیسؔ نے نہایت ذہانت کے ساتھ کہانی میں آنے والے پیچ وخم کے لئے ماحول کی تشکیل یہیں سے کردی ہے ۔ اپنی رہائی کی خبر پاکر شیریں حزن وملال اور ہجر ومفارقت کی کیفیتوں سے اس طرح دو چار ہوتی ہے۔

شیریں کے یہ سن کر ہوئے اشک آنکھوں سے جاری — لیں ہاتھوں سے بانو کی بلائیں بھی کئی باری
سجاد کو لے گود میں بولی کہ میں واری — اب تم سے جدا ہوتی ہے یہ لونڈی تمہاری
خط بھیج کے اپنا مرادل شاد کروگے
اس پالنے والی کو بھی کیا یاد کروگے

پھر پاؤں پہ سر حضرت زینب کے جھکایا — شفقت سے گلے شاہ کی خواہر نے لگایا
جب آپ کو اس نے قدم شہ پہ گرایا — سب روتے تھے حضرت کو بھی رونا بہت آیا
مولا کے نہ قدموں سے جدا ہوتی تھی شیریں
نعلین سے نتھ ملتی تھی اور روتی تھی شیریں

کہانی کی حزنیہ فضا قائم ہوچکی ہے۔ شیریں امام حسینؑ سے مع اہل حرم اپنے یہاں کسی نہ کسی روز مہمان ہونے کی درخواست کرتی ہے۔ امام حسینؑ کنیز کی درخواست کو قبول کرلیتے ہیں۔ اس عہد وپیمان کو انیس نے ایک بیت میں جس طرح نظم کردیا ہے وہ کہانی کے انجام سے واقف قارئین کے لئے پورے مرثیے سے کم نہیں ہے۔

فرمایا نہ کڑھ پورے سب ارماں ترے ہوں گے
ہم ساتھ حرم کو لئے مہماں ترے ہوں گے

انیس کا بیانیہ نہایت خوبصورتی سے کہانی کے نشیب وفراز طے کرتا ہوا یہاں تک پہنچتا

ہے۔ یہاں انیس کہانی میں گریز پیدا کرتے ہیں۔ کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ شیریں خانوادۂ اہلبیت سے جدا ہوتی ہے۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں سے کہانی تاریخ سے کٹ کر روایت کی طرف سفر کرتی ہے۔ لیکن روایت تھوڑی ہی دیر میں پھر تاریخ کی طرف لوٹ آتی ہے۔ کوئی اور کہانی کار ہوتا تو روایت کی بھول بھلیوں میں تاریخ کو فراموش کر جاتا لیکن انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ روایت، تاریخ اور کہانی تینوں کو اپنے بیانیے میں مضبوطی سے باندھے رکھتے ہیں کہانی کا نیا رخ دیکھئے۔

اک کوہ پہ تھا قلعہ کہ گھر اس کا تھا اس جا　　واں پہنچی تو شیریں کے ہوا حسن کا چرچا
تھا ایک یہودی کہ وہ طالب ہوا اس کا　　شیریں نے سنا جب تو پیام اس کو یہ بھیجا

گر ہے مرے وصلت کی تمنا ترے جی میں
تو کفر کو تو چھوڑ کے آ دین نبی میں

اپنی کہانی کے لئے انیسؔ کو جو ماحول دینا ہے اس کی بنیاد انیسؔ نے اس بند میں رکھ دی۔ ایک یہودی امیر کا شیریں کے حسن پر فریفتہ ہونا۔ پیغام عقد بھیجنا، جواباً شیریں کا یہودی کو مشرف بہ اسلام ہونے کی شرط لگانا۔ ساری جزئیات کہانی میں آنیوالے امور کی تمہید معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں شیریں کی شادی کا واقعہ روایت کے سہارے کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن انیسؔ کا مقصد کہانی میں آنے والے پیچ وخم کے لئے فضا کو سازگار بنانا ہے۔ دیکھئے انیسؔ یہاں روایت کے سیلاب میں بہے نہیں ہیں بلکہ کس قدر اختصار کے ساتھ روایت پر ایک نظر ڈال کر تاریخ کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انیسؔ اپنی کہانی کا پیراہن بنانے کے لئے تاریخ کے دامن میں روایات کے موتیوں سے کشیدہ کاری کرتے جا رہے ہیں۔

شیریں اپنی ازدواجی زندگی کے دن گزار رہی ہے۔ اب مرثیے میں شریں کے عشق حسینؑ اور فرقت حسینؑ میں اس کے اضطراب کا بیان شروع ہوتا ہے۔ مرثیے کے مسلسل سات بند حسینؑ کے وعدے کا انتظار اور شوق انتظار میں شیریں کی اضطراری کیفیات کی ترجمانی پر

مشتمل ہیں جو

کہتی تھی کہ یارب مرا گھر شہ کو دکھانا — وہ دن ہو کہ ہو زینب وکلثوم کا آنا
شبیر ادھر کو کہیں جلدی ہوں روانہ — اس لونڈی پہ اب شاق ہے تشریف نہ لانا
آقا مرے کیا جانے کب آئیں گے ادھر کو
کیا پھر کبھی دیکھوں گی میں زہرا کے پسر کو

کہتی کبھی ہمسایوں سے یہ بیٹھ کے باہم — آویں گے مدینے سے یہاں سید اکرم
خاتون قیامت ہے جو مخدومۂ عالم — اب بیٹیوں سے ان کی ملادیں گے تمہیں ہم
احمدؐ کی زیارت شہؑ والا کی ملاقات
زینبؑ کی ملاقات ہے زہراؑ کی ملاقات

اے بیبیو آقا ہیں مرے صادق الاقرار — آنے کو کہا ہے مرے گھر آئیں گے اک بار
زہرا کے چمن سے یہ مکاں ہوئے گا گلزار — فرزند نبی کا تمہیں دکھلائیں گے دیدار
آنکھیں قدم سبط پیمبر پہ ملیں گے
ہم دور تک لینے کو مولا کے چلیں گے

رہتا تھا یہی اس کو تردد سحروشام — اندوختہ کرتی تھی ضیافت کا سرانجام
جو میوے تھے مرغوب امام ذوی الاکرام — ان میووں کو منگواتی تھی دے دے کے وہ انعام
شوہر کوئی تحفہ جو اسے دیتا تھا لاکر
حضرت کے لئے رکھتی وہ کشتی میں لگا کر

تھا دھیان کہ آویں گے سفر سے شہ والا — کورے گھڑوں میں پانی بھرا رکھتی تھی ٹھنڈا
دن ڈھلتا تو شوہر سے یہ کرتی تھی تقاضا — شہ آتے نہ ہوں شہر کے ناکے پہ ذرا جا
آمد ہو اگر لشکر حضرت کی ادھر سے
میں بھی چلوں شہزادیوں کے لینے کو گھر سے

یہ شہ کے ہے لشکر کا نشاں اور یہ آثار   آگے علم سبز لئے ہوگا علمدار
ہوئیں گے عزیز ورفقا گھوڑوں پہ اسوار   اور بیچ میں ہوگا خلف حیدر کرار
ملبوس رسول عربی ہووے گا بر میں
تیغ اسد اللہ لگی ہوگی کمر میں

ناموس کی کچھ فاصلے سے ہوگی سواری   آوے گی نظر حضرت زینبؑ کی عماری
ہودج میں سوار آئے گی شہزادی ہماری   اور محملوں میں ہوویں گی سیدانیاں ساری
آگے یہ نقیبوں کا سخن ہووے گا سب سے
خاموش چلے جاؤ تفاوت سے ادب سے

یہاں انیسؔ نے اپنی تخیل کو شیریں کا تخیل بنادیا ہے۔ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہاں انیسؔ کے تخیل کا کہیں کوئی دخل ہے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ایک ماہر نفسیات کی مانند انیسؔ شیریں کے تخیل کے پیچ وخم کو پڑھتے جارہے ہیں اور اپنے لفظوں کے سہارے انھیں مرثیے کے پیکر میں ڈھالتے ہیں جارہے ہیں۔ شیریں کا تصور مزاج خانوادۂ رسالت اس کے جاہ وحشم اور شان وشوکت کے مطابق سوار اور پیادوں کے مقامات کو ترتیب دیتا جاتا ہے لیکن جب یہ تصور حقیقت سے روشناس ہوتا ہے تو شکست خواب کی ساری اذیتوں اور زمانے کی نیرنگیوں کا مرثیہ بن جاتا ہے۔

آگے یہ نقیبوں کا سخن ہووے گا سب سے
خاموش چلے جاؤ تفاوت سے ادب سے

کیوں! مرثیہ ہولیا نہیں؟ یہاں شریں انتظار واضطرار کی شدت سے دوچار ہورہی ہے اور ادھر امام حسینؑ اپنے اعزا وانصار کے ساتھ کربلا کے دشت میں شہید ہوچکے ہیں۔ انیس تھوڑی دیر کے لئے کہانی کو یہیں روک دیتے ہیں اور نہایت اختصار وجامعیت کے ساتھ کل دس گیارہ بندوں میں قتل سید الشہداء، اہل حرم کی اسیری، طوق وسلاسل میں سید سجاد کی گرفتاری مقتولین کی لاشوں پہ بیبیوں اور یتیموں کی گریہ وزاری۔ لشکر اعدا کی شقاوت قلبی، قیدیوں پہ تغیر وتعدی،

شدت الم سے عابد بیمار کی شکستہ نوائی زینب وام کلثوم کی زبوں حالی کا ماجرہ بیان کرتے ہیں۔ جہاں قیدیوں کے ہونٹوں پر بکا کے الفاظ ہیں۔ لاش حسین سے زینب کی گفتگو ہے، قتل کے بعد بھی امام حسینؑ کے لبوں پر یادِ خدا کے کلمات ہیں، یتیموں کے بین ہیں۔ اشقیا کی گھڑکیاں ہیں۔ پیاسے بچوں کو نفسیاتی اذیت پہنچانے کے لئے پانی سے بھرے ہوئے گھڑے ہیں۔ یہ سب بیانیہ کا وہ خوبصورت حصہ ہیں کہ قاری اپنے آپ کو ان مناظر میں شامل نظر آنے لگتا ہے۔

کہانی پھر ایک نئے اور اہم موڑ کی طرف مڑتی ہے۔ یہاں کہانی تاریخ کا سہارا لے کر کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں انیس کے بیانیے نے تاریخ میں بھی کہانی جیسا حسن پیدا کر دیا ہے۔ اہل حرم اسیر ہو کر کربلا سے دمشق کی طرف روانہ ہیں۔ نیزوں پر شہیدوں کے سر بلند ہیں جس نیزے پہ حسینؑ کا سر بلند ہے وہ نیزہ ایک دوراہے پر پہنچ کر رک جاتا ہے۔ حسین کا بریدہ سر میدانی راستے پر جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ چونکہ دوسرا کہساری راستہ قلعہ شیریں کی طرف سے ہو کر گذرتا ہے۔ کہانی کا یہ موڑ بڑا معنی خیز ہے۔ امام حسینؑ شیریں کے گھر مہمان ہونے کے اقرار کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ وعدے کی ایفا کا وقت آپہنچا ہے۔ سرِ حسین سے اس اعجاز کے نمایاں ہونے پر انیس عابد بیمار اور اشقیا کے بیچ یہ مکالمہ ادا کرتے ہیں۔

گھبرا کے لگے کہنے یہ عابد سے ستمگار — رکنے کا سرِ شاہ کے ظاہر کرو اسرار
فرمانے لگے رو کے یہ تب عابد بیمار — ہے مخبر صادق کا پسر صادق الاقرار
اعجاز ہوا یہ جو سرِ سبطِ نبی سے
اس راہ میں مہمانی کا وعدہ ہے کسی سے

اور کہانی ایک بار پھر مرثیے کا مطلع دہرانے لگتی ہے۔ ”اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیر“ قافلہ قلعہ شیریں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شیریں کو اطلاع ہوتی ہے کہ امام حسینؑ کا قافلہ نہایت تزک واحتشام کے ساتھ اس کے گھر کی جانب آرہا ہے۔ ایک مدت سے انتظار کھینچنے والے عاشق صادق پر زیارت محبوب کا مژدہ پا کر جو کیفیت طاری ہو سکتی ہے۔ نہایت

فطری انداز میں انیسؔ اسکا بیان کرتے ہیں ۔

اس مژدے کو سنتے ہی جو خوش ہوگئی شیریں　　بولی کہ ہوئی اب دل بے تاب کو تسکین
صد شکر کہ خالق نے نہ رکھا مجھے غمگین　　وعدہ جو کیا تھا اس بھولے نہ شہ دین
اب چل کے قدم پر شہ والا کے گروں گی
دن میرے پھرے گرد میں آقا کے پھروں گی

عورات محلّہ کو بلا کر یہ سنایا　　دو تہنیت اے بیبیو آقا مرا آیا
یہ روز مبارک مجھے قسمت نے دکھایا　　اب عرش کے پائے سے ہے بڑھ کر مرا پایا
کونین میں ممتاز کیا شاہ زمن نے
لونڈی کو سرافراز کیا شاہ زمن نے

مرثیے کے اگلے دو بند شیریں کی ہمسایہ عورتوں کے اشتیاق زیارت کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ جو شیریں کے انتظار کی شدت اور حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے کے ساتھ اس مقدس گھرانے کے احترام کا بھی پتہ دیتے ہیں۔شیریں حسینؑ کی ڈیوڑھی سے جدا ہونے کے بعد بھی حسینؑ کے گھر کو کوئی دم بھول نہیں پائی اور اپنے ہمسایوں سے اس نے حسینؑ کے گھر آنے کی عظمتوں کا تذکرہ اس انداز میں کیا کہ تمام اہل قریہ قافلہ حسینؑ کی زیارت کے مشتاق نظر آنے لگے۔ قافلہ حسینؑ سے شیریں کے ہمسایوں کا یہ جذباتی لگاؤ دیکھیے ۔

سب نے کہا خوش ہو کے ہمیں بھول نہ جانا　　ہم کو بھی بہن حضرت زینبؑ سے ملانا
شہزادی کا اپنی ہمیں دیدار دکھانا　　قسمت سے ہوا فاطمہ کے لال کا آنا
حضرت کی سواری کا حشم دیکھیں گے ہم بھی
سردار دوعالم کے قدم دیکھیں گے ہم بھی

عباس علی کے قد و قامت کے ہیں مشتاق　　اور قاسم مہرو کی بھی طلعت کے ہیں مشتاق
زینب کے جگر بندوں کی صورت کے ہیں مشتاق　　ہم مثل پیمبر کی زیارت کے ہیں مشتاق

گلرو ہے کوئی ان میں کوئی غنچہ دہن ہے
کہتے ہیں بڑے حسن پہ زہراؑ کا چمن ہے

کہانی آگے بڑھتی ہے۔ آنے والے مہمانوں کے انتظار میں شیریں کی بے قراری شدید ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنے محترم اور باوقار مہمانوں کے لئے کہیں کرسی بچھاتی ہے، کہیں مسند، کبھی حجرے میں رکھی ہوئی نذر کی کشتیاں سجاتی ہے کبھی اضطراب واضطرار میں صحن کے دروازے پر جاتی ہے۔ یہیں کہانی میں Thrill کا اضافہ ہوتا ہے۔ مدت سے ہجر کا غم کھینچنے والی شیریں شام ہوتے ہوتے امید وبیم کی منزلوں سے گذرنے لگتی ہے۔ انیسؔ شیریں کی امید و یاس کا بیان اسی طرح کرتے ہیں۔

دن ڈھل گیا اور جب نہ ہوئی آمد سروؑ — شوہر سے کہا اب تو نہایت ہوں میں مضطر
جا دیکھ تو اترا ہے کہاں شاہ کا لشکر — کہیو قدم پاک کو آنکھوں سے لگا کر

شیریں کی ہے یہ عرض کہ اب آیئے مولا
لونڈی کو قریب آکے نہ ترسایئے مولا

شیریں کا شوہر قلعے سے نیچے اتر کر فوراً قافلے تک پہنچتا ہے۔ لیکن وہ جس تصور کو یہاں لے کے آیا تھا معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ وہ عمر سعد کے خیمے کہ نگہبانوں سے کبھی عون ومحمد کو پوچھتا ہے کبھی عابد بیمار کو کبھی علی اکبر، کبھی عباس کے خیمے کا پتہ پوچھتا ہے کبھی خیمہ ناموس کی ڈیوڑھی لیکن اس کی حیرت نامرادیوں میں بدل جاتی ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ لشکر حسین کا نہیں بلکہ قاتلان حسین کا ہے جو ناموس حسینؑ کو گرفتار کرکے لایا ہے۔ دیکھئے شیریں کا شوہر کیسے مناظر سے دو چار ہوتا ہے۔

سیدانیاں بیٹھی ہیں وہ چہرے پہ ملے خاک — زینب ہے وہی ماتمی پہنے ہوئے پوشاک
وہ بانوئے بے کس ہے گریبان کئے چاک — بیٹھی ہے وہ کلثوم بہن شاہ کی غم ناک

کبریٰ ہے وہ زانو پہ جھکائے ہوئے سر کو
وہ بالی سکینہ ہے جو روتی ہے پدر کو

ہم عرض کر چکے ہیں کہ انیسؔ کو بیانیہ کے فن میں مہارت حاصل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کہانی کو کلائمکس تک پہنچتے پہنچتے کس کس پیچ وخم سے گذرنا ہے۔ اس لئے وہ ہر آنے والے موڑ کے لئے کہانی کی ابتدا میں ہی فضا سازگار کرتے چلے جاتے ہیں۔ عقد کے وقت شیریں کی شرط زن وشوہر کے درمیان تفاوت کی مظہر ہے۔ انیسؔ شیریں کے شوہر کا جیسا کردار دکھلانا چاہتے ہیں کہانی کے آخر تک وہی کردار باقی رہتا ہے۔ چنانچہ شیریں کے اضطرار پر شوہر کا قلعے سے نیچے اتر کر لشکر تک آنا اور وہاں کا منظر دیکھ کر سر وسینہ پیٹتے ہوئے لوٹنا کردار کے مزاج کے عین مطابق نظر آتا ہے۔

کہانی کا اگلا موڑ نہایت اہم اور معنی خیز ہے۔ وہ کوہ الم جو شہادت حسین کی خبر سن کر شیریں پر گرا اس پر شیریں اور اس کے شوہر کا ردعمل انیسؔ کے بیانیے کا ایک اہم جز ہے۔ یہاں انیس تاریخ کی واقعیت پر قدم رکھے کھڑے ہیں اور انکا تخیل شیریں کا اضطراب اس کے شوہر کی سراسیمگی اور حسین کے بے یار و مددگار قافلے کی غیرت وحیا کو دیکھ رہا ہے۔ انیسؔ کے بیانیے کا فن اپنے قاری کو اس بزم غم میں لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

شیریں تھی جو یاں منتظر سبط پیمبر — رونے کا جو اک شور سنا ہوگئی ششدر
دیکھا کہ چلا آتا ہے سر پیٹتا شوہر — ڈیوڑھی پہ سراسیمہ نکل آئی کھلے سر
چلا کے کہا کس نے تمہیں لوٹ لیا ہے
جلدی ارے لوگو کہو یہ ماجرا کیا ہے

سر پیٹ کے تب شوہر شیریں یہ پکارا — بی بی ترے آقا کو ستمگاروں نے مارا
زہراؑ کا پسر خلق سے جنت کو سدھارا — سادات کا تو قافلہ لوٹا گیا سارا
بھیجا تھا جہاں تو نے وہ لشکر ہے شقی کا
سر کاٹ کے لائے ہیں حسین ابن علیؑ کا

تو منتظر اب کس کی ہے کون آئے گا بی بی — لحد ہے سو بیمار ہے رانڈ یں ہیں سو قیدی
شیریں نے کہا بیٹ کے سر کوٹ کے چھاتی — ہے ہے مرے سید امیرے آقا، میرے والی
لٹوا کے گھر اور تیغ سے کٹوا کے سر آئے
فرمایا تھا آؤں گا سو یوں میرے گھر آئے

یہ کہہ کے چلی پیٹتی اور دیتی دہائی — رستے میں کہیں گر پڑی ٹھوکر کہیں کھائی
اک بار خبر آنے کی شیریں کے جو پائی — زینب نے کہا ہائے سلامت نہیں بھائی
پرسے کو وہ آئی ہے سویاں گھر بھی نہیں ہے
منہ کا ہے سے ہم ڈھانپیں کہ چادر بھی نہیں ہے

انیس کہانی کو یہاں تک لا کر شیریں کے اس بین کو اجاگر کرتے ہیں جو وہ شہادت حسینؑ کے المیے پر قافلہ اہل حرم میں آ کر کرتی ہے یہ بین فطرت و حقیقت سے اتنا نزدیک ہے کہ قاری خود کو کسی سانحے پر بین کرنے والی مستورات کے درمیان کھڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شیریں بین کرتے کرتے اس نیزے کے پاس پہنچ جاتی ہے جس پر امام حسینؑ کا خون آلودہ سر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ شیریں کبھی اپنی شہزادی کے بے وارث ہونے پر گریہ کرتی ہے۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے شہزادے کی خستگی پر فریاد کرتی ہے۔ کبھی اجڑی ہوئی گودوں کا ماتم کرتی ہے کبھی خود سر حسینؑ سے مخاطب ہو کر بین کرتی ہے۔

آقا تری اس خون بھری تصویر کے واری — میں مر نہ گئی ہائے بلا لے کے تمہاری
اس بین سے شیریں نے کی جو گریہ وزاری — نیزے پہ سر شاہ کے آنسو ہوئے جاری
پیدا یہ لب خشک سے حضرت کے صدا تھی
کیوں روتی ہے شیریں یہی مرضی خدا تھی

حسینؑ اپنے بریدہ سر سے شیریں کے لئے تشفی کے وہ کلمات ادا کرتے ہیں جو کردار حسینؑ کے مزاج کے عین مطابق ہیں۔ حسینؑ کا سر ایسے عالم میں بھی حسینؑ کے صادق الاقرار ہونے اور عہد کے ایفا کرنے پر شکر ادا کرتا ہے۔ بین و بکا کے اس ماحول میں بریدہ سر خود اپنے

کنبے کے مظلوموں کی داستان دہرانے لگتا ہے۔ شیریں سے سر حسینؑ کا مکالمہ دیکھئے۔

زینب کی خبر لے کہ ہے قیدی مری خواہر — بنت اسداللہ کے سر پر نہیں چادر
ہے خاک سے کبریٰ نے چھپایا سر انور — شہزادی تری آج ہے بلوے میں کھلے سر

احسان کا یہ وقت ہے عبرت کی یہ جا ہے
وہ قیدی ہے جس نے تجھے آزاد کیا ہے

سیدانیوں کو چادریں کچھ لا کے اڑھا دے — رانڈوں کی مدد کر کہ خدا تجھ کو جزا دے
راضی ہوں نبی صاحب تطہیر دعا دے — محشر میں تجھے حلۂ فردوس خدا دے

بے وارث و والی ہیں گرفتار بلا ہیں
محتاج کفن ہم ہیں یہ محتاج ردا ہیں

صاحب عزا کنبے میں ایک نئے مہمان کے داخلے پر زینب کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ گریہ و شیون کی فضا ایک اور نیا رخ لے لیتی ہے۔ خود زینب سر حسین سے مکالمہ کرنے لگتی ہیں ؎

جیتی ہے بہن کس لئے کڑھتے ہو برادر — تن پر تو ہے سر کو مرے سر پر نہیں چادر
گردن پہ تو بہنا کے پھرایا نہیں خنجر — لاشہ تو مرا دھوپ میں جلتا نہیں دن بھر

غم کھاؤ نہ چادر جو نہیں پاتی ہوں بھائی
بالوں سے تو منہ ڈھانپے چلی جاتی ہوں بھائی

شیریں کا گریہ و شیون بڑھتا جا رہا ہے۔ یہاں شیریں کا کرب اور اس کا نالہ و گریہ قابل دید ہے ؎

زینب تو یہ کہتی تھی سر شاہ سے رو کر — چلاتی تھی شیریں کہ میں صدقے ترے سرور
ان آنکھوں کی تعریف کیا کرتے تھے اکثر — کیوں ہو نہ گئے کور مرے دیدۂ انور

ہوتیں نہیں سیر آپ کے دیدار سے آنکھیں
لاؤ تو ملوں چاند سے رخسار سے آنکھیں

یہاں بیانیہ کی قوت آپ نے ملاحظہ کی۔ شاید یہی کہانی کا کلائمکس ہوتا اگر یہ مرثیہ

انیسؔ کی تخلیق نہ ہوتا لیکن انیسؔ ایک مرثیہ نگار کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کہانی کے بیانیے کو بھی فوت نہیں ہونے دیتے اور مرثیے کو بھی دم نہیں توڑنے دیتے۔ انیسؔ کہانی میں ایک اور موڑ لے آتے ہیں جو روایت اور تاریخ دونوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ شریں عمر سعد کے لشکر کو زرومال کا لالچ دے کر سر حسینؑ اور اسیران حرم کو اپنے یہاں ایک شب مہمان رکھنے کی اجازت حاصل کر لیتی ہے۔ اور اہلبیت حسینؑ ایک شب کے لئے شیریں کے گھر مہمان ہو جاتے ہیں۔ کہانی قاری کو ایک اور نئی بزم میں لے جاتی ہے۔ جہاں مدت سے آلام و مصائب میں گرفتار حسینؑ کا غیور گھرانہ ایک ہمدرد اور عقیدت مند کے گھر میں قیام کرتا ہے۔ اپنی وضع داریوں اور غیرتوں کے ساتھ ایک کنیز کے گھر میں قدم رکھتے ہوئے خانوادۂ رسالت کے افراد جس عسرت و زبوں حالی کی کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں انیسؔ کی تخیل انھیں اس طرح اپنے لفظوں میں ڈھال لیتی ہے۔

چلاتی تھی بانو مرے سید مرے سرور — شیریں کے گھر آئے مجھے اس حال میں لے کر
لپٹی ہوئی کہتی تھی سر شاہ سے خواہر — مہمان بہن آئی ہے سر پر نہیں چادر

غیرت سے موئی جاتی ہے صدمہ ہے بہن پر
ثابت نہیں کرتا بھی سکینہ کے بدن پر

حسینؑ اور ان کے اہلبیت کی تواضع کے لئے شیریں نے جو کھانے اپنے گھر تیار کرائے تھے وہ اہلبیت سے ان پر حسینؑ کی فاتحہ دینے کی درخواست کرتی ہے۔ عابد بیمار فاتحہ دیتے ہیں۔ رانڈوں میں ایک کہرام برپا ہوجاتا ہے۔

ایسے عالم میں یتیموں کے یہ بین دیکھئے۔

روکر کہا زینب نے بہن ہوگئی واری — میں جیتی ہوں اور فاتحہ ہوتی ہے تمہاری
کیا پیاس تھی جس دم تھا لہو زخموں سے جاری — پانی نہ کسی نے دیا مانگا کئی باری

جب تم تھے تو ملتا تھا نہ پانی کہیں بھائی
اب پانی تو موجود ہے اور تم نہیں بھائی

روتی ہوئی اتنے میں اٹھی بانوئے بے پر — اک دودھ کا کوزہ رکھا اک پانی کا ساغر
سجاد سے رو رو کے کہا اے مرے دلبر — ان دونوں پہ دو فاتحۂ اکبر واصغر

مارے گئے کس ظلم وجفا سے مرے بچے
تھے تین شب وروز کے پیاسے مرے بچے

وہ ضبط گریہ جو ابھی ہم کہانی میں سید سجاد سے دیکھتے آئے ہیں۔شیریں سے حسین کی فاتحہ دلانے کی پیش کش پر اس کا باندھ بھی ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ایک موت کے گھر میں جہاں وقت نے دھیرے دھیرے شور گریہ کو کم کردیا تھا اچانک ایک بار پھر مرنے والوں کی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں اور بین وبکا کی صدائیں بلند ہوجاتی ہیں یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ وہ عزادار ہیں جن پر قتل حسین کے بعد سے لے کر گریہ وشیون پر پابندی بھی تھی اور جو کسی ہمدردی جتانے والے کی عدم موجودگی کے احساس سے بھی دوچار تھے۔اب کہانی میں ایک ایسا کردار داخل ہوچکا ہے جس کی بدولت ایک شب کے لئے گریہ وشیون سے پابندی بھی اٹھ گئی ہے اور جو اس مجلس شیون میں انکا ہمدرد بن کر ان کا شریک بھی ہے۔

فاقہ شکنی کا جو اسیروں نے سنا نام — پیٹے یوں سروسینہ کہ برپا ہوا کہرام
زینب نے کہا کھانے کا ہے کون سا ہنگام — نے چین محمد کو نہ زہرا کو ہے آرام

کیا کھانے کو ہم کھائیں کہ دل غم سے بھرا ہے
لاشہ تو ابھی بھائی کا جنگل میں پڑا ہے

بھائی تو ہے بے گوروکفن کھاؤں میں کھانا — بے دفن ہو فرزند حسن کھاؤں میں کھانا
بے سر علی اکبر کا ہو تن کھاؤں میں کھانا — پامال ہو زہرا کا چمن کھاؤں میں کھانا

رونا مجھے دیکھے سے چلا آتا ہے لوکو
لے جاؤ کہ کھانا مجھے یہ کھاتا ہے لوکو

ناچار ہو اک جام کو شیریں نے اٹھایا — پاس آن کے ہونٹوں سے سکینہ کے لگایا
بولی کہ پیو اری دم آنکھوں میں ہے آیا — منہ پھیر کے شیریں کو سکینہ نے سنایا

پیاسے مرے بابا ہوئے میں بھی نہ جیوں گی
عباس چچا آئیں گے جب پانی پیوں گی

شیریں کی فاقہ شکنی کی یہ درخواست اسیروں کے زخموں کو کرید دیتی ہے۔ قیدیوں کا یہی کہرام مرثیے کو اختتام تک پہنچاتا ہے کہانی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے انیسؔ نے ایک اجڑے ہوئے گھر کے کہرام کو جس سچائی اور فطری پن کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا ہے وہ انیسؔ کے بیانیے کا خاص حصہ ہے۔ جہاں انیس نے ایک ایک فرد کی زبان سے ایک ایک مصرعے میں اپنے اپنے عزیز کا مکمل مرثیہ کہلوا دیا ہے۔

انیسؔ نے جس فضا میں مرثیے کا آغاز کیا ہے وہاں سے کہانی کئی موڑ لیتی ہوئی اختتام تک پہنچتی ہے۔ یہ پیچ وخم ایسے نازک تھے کہ کسی بھی موڑ پر کہانی کار کے بہک جانے یا بھٹک جانے کا خطرہ بنا ہوا تھا لیکن کہانی کے کس موڑ پر ٹھہرنا ہے۔ کس موڑ سے سرسری گزر جانا ہے۔ کہاں اختصار سے کام لینا ہے۔ کہاں تفصیل سے۔ انیسؔ اس رمز سے خوب واقف ہیں۔ جہاں ٹھہرنا ضروری ہے وہاں انیسؔ ٹھہرے ہیں۔ جہاں نگاہ ڈال کر گذر جانا تھا وہاں انیسؔ نگاہ ڈال کر گذر گئے ہیں۔ تا کہ کہانی کا اصل مقصد بھی فوت نہ ہو۔ کہانی کا تجسس اور دلچسپی بھی کم نہ ہونے پائے۔ کہانی کا کلائمکس کہاں اور کس طرح ہونا چاہئے اور اس کا تقاضہ کیا ہے سب پر انیسؔ کی مکمل دسترس ہے۔ اکثر کہانیوں میں دیکھا گیا ہے کہ راستے کے پیچ وخم میں الجھ کر منزل کھو جاتی ہے۔ کہیں اختصار کہانی کی معنویت کا قاتل بن جاتا ہے کہیں تفصیل۔ انیسؔ جیسا ماہر کہانی کار ان سارے عناصر کو نگاہ میں رکھ کر کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ کلائمکس تک پہنچنے کے لئے اسے جن اسباب وعلل کی ضرورت ہے اس کے لئے وہ کہانی کی ابتدا سے ہی فضا سازی میں مصروف نظر آتا ہے۔ کس کردار کو کہاں کس وقت منظر میں داخل ہونا ہے۔ کس کردار کو کب اور کہاں منظر سے باہر ہوجانا ہے۔ اس کی پوری احتیاط انیسؔ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ کس کردار سے کیا کام لیا جانا ہے اس کردار کے مزاج اور اس کی

نفسیات کی وضاحت میں انیسؔ سے زیادہ ماہر فنکار کون ہوگا؟ انیسؔ نے کہیں بھی بڑوں سے چھوٹوں کے اور چھوٹوں سے بڑوں کے، آقا سے غلام کے اور غلام سے آقا کے کام نہیں لئے ہیں۔ کس کردار کی زبان پر کون سے فقرہ جچتا ہے۔ کہاں مکالمے کا کیا انداز ہونا چاہئے۔ انیسؔ سب جانتے ہیں چنانچہ کسی ظالم سے شریفانہ فقرہ یا کسی محترم شخصیت سے عامیانہ گفتگو انیسؔ کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ انیسؔ کردار کو اس کام کی مناسبت سے مزاج اور نفسیات بخشتے ہیں۔ جو کردار تاریخی حیثیت رکھتے ہیں ان کے مزاج اور انکی نفسیات کو سامنے رکھ کر ہی انیسؔ نے مکالمے اور منظر نامے تخلیق کئے ہیں۔ انیسؔ نے جہاں روایت کو تاریخ پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے وہیں تاریخ کو تاریخ کی طرح خشک اور بے روح بھی نہیں بنادیا ہے بلکہ اس میں اپنے بیانیے کی قوت سے کہانی کا حسن پیدا کردیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ انیسؔ کی کہانی پر تاریخ کی صداقتوں کی مہر اور انیسؔ کے بیان کردہ تاریخی واقعے پر کہانی کی دلکشی کا گمان گذرتا ہے۔ یہی انیس کی کہانی کا فنیہ۔ یہی انیسؔ کے بیانیے کی عظمت ہے جو انہیں اس فن کا تاجدار بنادیتی ہے۔